# نسائی تحریک: ادبی تناظر میں

کاشفہ چودھری*

ڈاکٹر شازیہ عنبرین**

**Abstract:**

Feminism formulates an integral concept of the feminist movement that promotes gender equality and opposes perpetuation of gender discrimination at economic, social and cultural front. The agenda of this movement includes acting as a platform to counter the social inequality and challenge the politicals structure, dominant power holders and traditional beliefs or practises. The theme of this article revolves around the analysis of feminist movement with respect to the folk culture and traditions. On one hand, it seeks to revise the identity of women at international level and on the other hand, it enables them to raise their voice to face the modern challenges. The literature is filled with examples, where women have complained of their subdued status, yet it is important to understand that in order to develop a healthy society, it is essential to encourage the growth of individuality amongst women.

نسائیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک تحریکِ نسواں ہے۔جس کا بنیادی مقصد خواتین کو ان کا جائز اور صحیح مقام دلانا ہے۔ایک طرف یہ تحریک خواتین کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کی نشان دہی کرتی ہے۔(جیسے مردوں کی بالادستی، عدم مساوات، جابرانہ اور ہتک آمیز رویہ وغیرہ) جبکہ دوسری طرف خواتین کا عالمی سطح

* پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

پر اپنا ایک واضح تشخص اجاگر کرنا اور طبقۂ نسواں کے ساتھ اس رویے کے اصل اسباب تلاش کر کے ان کے حل کے لئے موثر جستجو کرتے ہوئے تلافی کرنا ہے۔

نسائیت کی اصطلاح کا اولین ماخذ فرانسیسی لفظ Feminisme ہے یہ اصطلاح سب سے پہلے مثالی سوشلسٹ مفکر چارلس فوریئر (Charles Fourier) نے وضع کی (۱)۔ جن ادیبوں نے خواتین کے علیحدہ تشخص کو تسلیم کیا، عورتوں پر مردوں کی بالادستی کے سنگ دلانہ رجحانات کو بہ نظر تشویش دیکھا، ایسے ادیبوں کو نسائیت پسند ادیب کہیں گے چنانچہ اس دور کی ایک خاتون ادیب، میری وال اسٹوز نے اس مسئلے کے متعلق ایک کتاب ''عورتوں کے حقوق کی حمایت'' (A Vindication of the rights of women) کے عنوان سے لکھی، جو ۱۷۹۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی (۲)۔ اس کتاب میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا گیا کہ کل آبادی کا پچاس فیصد حصہ بغیر تعلیم کے کیسے گھر کی چار دیواری میں اپنے بچوں کو تربیت دے سکے گا۔ لہذا اس سلسلے میں تو کافی احتجاج نظر آتا ہے، اس کے علاوہ سیاسی، معاشی اور دیگر امور پر نظر نہیں ڈالی گئی شاید اس وقت کی ضرورت یہی تھی پدرسری سماج میں عدم توازن اور عدم مساوات کے باعث حاکم اور محکوم کا رویہ ابتدا سے ہی چلا آ رہا ہے مگر گزشتہ دو صدیوں میں ممکن ہوا کہ اس احتجاج کو سنجیدگی سے دیکھا جانے لگا۔ یورپ میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یعنی فرانسیسی انقلاب کے فوراً بعد نسائیت کا سراغ بطور ایک تحریک کے وقتاً فوقتاً لگایا جاتا رہا ہے۔ خواتین کے کلب قائم کئے گئے ہیں، جہاں عورتوں کے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کا عمل نہ طرف یہ کہ جاری رہا بلکہ اس تحریک کو بتدریج فروغ بھی ملتا رہا اور یہاں اس طرح کے سیاسی پروگرام تشکیل دیئے جاتے رہے، جن میں عورتوں کی تعلیم، انکے مستقل روزگار کے علاوہ حکومت میں اشتراکِ عمل کے مطالبات کئے جاتے رہے۔ حکومتوں کا رویہ خواتین کے لئے ہمدردانہ کی بجائے جارحانہ رہا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئندہ آنے والی خواتین نے اپنے حقوق کی جنگ کو اس درجہ تیز کر دیا کہ اس طوفانِ مزاحمت نے عالمی سطح پر دوسرے ممالک کی خواتین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ بھی ان کے ساتھ میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ انیسویں صدی کے دوران امریکہ میں نسائیت نے نہ صرف یہ کہ بہت ترقی کی، بلکہ یہ تحریکِ نسواں دوسرے ممالک کی خواتین کے لئے ایک ماڈل کی صورت اختیار کر گئی (۳)۔ خواتین کی طویل جدوجہد کے بعد ۱۹۲۰ء کے آخر تک اگرچہ دنیا کے تمام ممالک میں نہ سہی تاہم کئی ممالک میں خواتین کو مکمل ووٹ ڈالنے کا استحقاق حاصل ہو گیا۔ نسائی تحریک کا مطالبہ صرف ووٹ ڈالنے کی آزادی تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس وقت کی خواتین تخلیق کاروں کے سامنے جو مسائل تھے وہ ان کا حل بھی چاہتی تھیں جن میں خواتین کی تعلیم، روزگار، معاشی آزادی، خود انحصاری، مساویانہ طرزِ بود و باش، مساوی تنخواہ، مساویانہ ذمہ داریاں جن میں گھر

کی ذمہ داری، بچوں کی تربیت ونگہداشت کی ذمہ داری وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔خواتین کے یہ مسائل ''میری وال اسٹون کرافٹ'' کی تحریر میں (۱۷۹۲ء) میں بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ ۱۹۲۰ء میں ''ویرابریٹین''اور ''ورجیناوولف''(Vera Britan , Verginawolf)نے وال اسٹون کے پیش کردہ بنیادی نکات کو مزید واضح کیا اوراس تحریک کے احیاء میں بھرپور کردار ادا کیا۔انہوں نے اپنی تحریروں میں عورتوں کے لئے روزگار کی فراہمی اوران کی معاشی آزادی کے اقتصادی خودانحصاری کے مسئلے کو پوری شدومد سے اپنی تحریروں میں اٹھایا(۴) عورت اور مرد کے درمیان ایک کشمکش ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ہیگل نے کہا تھا شعورِ ثانی محتاج شعور ہے۔جس کے لئے لازمی حقیقت زندگی کی حیوانی قسم ہے،یعنی کسی دوسری ہستی کا مرحمت کردہ طرزِ حیات(۵)۔لیکن اس تعلق کو غلامی کے تعلق کے تناظر میں دیکھنا ہوگا، کیونکہ عورت ان اقدار کی تمنا اورانہیں تسلیم کرتی ہے،جنہیں مرد نے ٹھوس انداز میں حاصل کیا ہے۔مرد ہی وہ مستقبل منکشف کرتا ہے،جس تک عورت پہنچتی ہے۔درحقیقت عورت نے مردانہ اقدار کی مخالفت میں کبھی نسوانی اقدار قائم نہیں کیں۔مردانہ استحقاق قائم رکھنے کے خواہشمند مرد نے ہی اختلافات اختراع کیے۔مردوں نے نسوانی قلمرو زندگی کی داخلیت کی بادشاہت بنانے کی جسارت صرف اس لئے کی تاکہ عورتوں کو اس کے اندر بند کردیں،لیکن وجود جنس سے قطع نظر ماورائیت کے ذریعے خود تو جیہی تلاش کرتا ہے۔عورتوں کی اطاعت گزاری ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آج وہ اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ انہیں مردوں والے حقوق کے ذریعے بطور وجود تسلیم کیا جائے اور زندگی کی محکومی یعنی حیوانیت کی سطح پر نہ رکھا جائے(۶)۔

خواتین نے جو ادب تخلیق کیا،وہ منفرد فضا اور اقدار رکھتا تھا۔اس میں ان کے تجربات واحساسات شامل تھے جو مرد سے یکسر مختلف تھے خواتین کو ایسا آزادانہ،سازگار ماحول چاہیئے ،جو اس کے اظہار کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہو۔سیمون دی بووا کی کتاب(The second sex) ہر اعتبار سے نسائی تحریک کے نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب کا مقصد عورت کے معاشرتی مقام،اس کی جنسی حیثیت اوراس کی پسماندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا تھا،اس کتاب نے دنیا بھر کی خواتین میں بیداری کی لہر پیدا کر دی اور عورت سودوزیاں سے بلند تر ہوکر اپنے صحیح مقام کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی(۷)۔

نسائی تحریک کی حامل خواتین کی جدوجہد کو دبانا،ناقابل فہم ہے کہ جو انسانوں کے درمیان جدوجہد کی داستان کا عنوان پاتی ہیں۔اب چونکہ معاشرے میں عورت جبر کا شکار ہے،اس لئے اسے جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے سے پہلے جبر کے بارے میں آگاہ ہونا چاہیئے(۸)۔

سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ خاتون ہوتی ہے جو موجودہ روایت کو چیلنج کرتی اور سوسائٹی کے عدم

انصاف کی دہائی دیتی ہے۔احتجاجی ادب، موثر اور بھرپور ادبی منظر نامہ پیش کرسکتا ہے۔جارج ایلیٹ نے وکٹورین برطانیہ کے آخر کا نقشہ کھینچا۔ورجینا وولف، جین آسٹن، برونٹے سسٹرز نے عورت کا اصل کردار اور اس پر ڈالے گئے بوجھ کی موثر تصویر کشی کی۔ایلیٹ نے تو عورتوں کا حوصلہ بڑھانے اور سچ بولنے کی ہمت کرنے کو، اپنی قوت کو مثبت طور پر استعمال کرنے، عورت کو اپنا منفرد رنگ اور بے جھجک لکھنے کا حوصلہ بھی دیا۔درج بالا خواتین مصنفین میں دستووسکی اور ٹالسٹائی والی عظمت تو نہیں آئی پھر بھی کچھ زنجیریں تو ٹوٹیں (۹)۔

برصغیر میں مسلمان صوفی شعراء نے معاشرے میں خواتین کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوششیں کیں۔سندھ کے مسلمان صوفیاء نے رامانج کی بھگتی تحریک کا اثر بھی قبول کیا تھا۔کیونکہ اس میں تمام انسانوں کے لیے پیار اور بھائی چارہ کا تصور موجود تھا۔یہ کمزور اور غریبوں کے لیے ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔صوفی شعراء نے اپنی شاعری میں نسائی جذبات کی ترجمانی کی۔بقول شیخ ایاز ''ایک تو سندھی لوک کہانیوں میں نسائی کردار زیادہ فعال اور متحرک ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت جبر اور محرومی کی علامت ہے۔اور تیسرا سبب سب سے اہم ہے وہ یہ کہ شدتِ احساس کے باوجود عورت زندگی کو اپنے تمام عذابوں کے ساتھ قبول کرنے کا استعارہ ہے۔اس کے برعکس مرد کا کردار اتنا فعال، اتنا حساس اور اتنا مجروح نظر نہیں آتا (۱۰) یہی وجہ ہے کہ ہمارے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف ان لوک کہانیوں کی کردار عورتوں کے صرف خارجی یا صرف داخلی حالات کا تجزیہ نہیں کرتے بلکہ ان کے جذبات و احساسات اور دلی کیفیات کا بھی اظہار کرتے ہیں اور انہیں بہت مضبوط اور مستقل مزاج انسانوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔اس مزاج کے تمام کمزور طبقات کو ان داستانوں کی سورمیوں (ہیروئنیں) جیسی ہمت، جرات، جدوجہد، قربانی، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی اختیار کرنے کا پیغام دیا ہے انہیں یہ احساس دلانا چاہا ہے کہ جب صنفِ نازک کی کمزور کنیائیں اپنے غیر متزلزل یقین سے اتنی بڑی بڑی رکاوٹوں کو پار کر کے اپنی منزل پر پہنچ سکتی ہیں تو کیا آپ لوگ ایسا نہیں کر سکتے؟ صوفی شعراء کا عورتوں کے ساتھ براہ راست مخاطب ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انہیں ان کی سماجی حیثیت کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور ایک طرح سے ان کی انفرادی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے ان کو اپنے آپ کو اور اپنی صلاحتوں کو پہچاننے کا شعور دینا چاہتے ہیں۔(۱۱)

اس خطے کی مقبول داستانوں کا جائزہ لیں، تو اس حوالے سے تنقیدی نگاہ کے لئے کئی نکات قابلِ غور ہیں۔لوک داستانوں کے نسوانی کردار مجموعی طور پر مرد کرداروں کی نسبت زیادہ جاندار اور متحرک ہیں۔دلیر، نڈر اور بے باک ہیں، مستقل مزاج ہیں اور مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہیں اور ان کے اندر قوتِ فیصلہ بھی ہے اور اپنے فیصلوں پر ڈٹ جانے کا ہنر بھی وہ جانتی ہیں۔مثال کے طور پر وارث شاہ کی شاہکار تخلیق 'ہیر' کو لیجیے جس کا سب سے جاندار کردار ہیر

ہی ہے۔ وہ شروع سے آخر تک داستان پر چھائی ہوئی ہے۔ ہیر دوسری رومانوی لوک داستانوں کے مرکزی نسوانی کرداروں مثلاً سوہنی، ادرسی، کوراں، سسی، دنتی وغیرہ سے ان معنوں میں مختلف اور منفرد ہے کہ یہ تمام نسوانی کردار ایثار و قربانی، صبر و قناعت کا پیکر اور سراپا راضی بہ رضا ہیں۔ ان کے بالکل برعکس ہیر کے کردار میں جو شکوہ اور طنطنہ دکھائی دیتا ہے وہ پنجاب کی دیہاتی عورت کی سوجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھوس حقیقت پسندی کا عکاس بھی ہے۔ جب وہ سہتی سے کہتی ہے کہ حسن اور جوانی چار دن کے مہمان ہیں کیوں نہ میں اور تم مل کر اپنے محبوب کے وصل سے شاد کام ہوں:۔

میرے واسطے اوس نے لیے ترلے کیویں اوس دی آس پوچائیے نی
تینوں ملے مراد تے اساں ماہی دونویں اپنے یار ہنڈائیے نی
ایہہ جو بنا ٹھگ بازار دا ہے سر کسے دے ایہہ چڑھائیے نی
کوئی روز دا حسن پراہنا ای مزے خوبیاں نال ہنڈائیے نی (۱۲)

وہ اس بات کا پرچار کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی بسر کرے۔ آج جو عورت مردوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے ہیر کو ان کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے وہ برملا کہتی ہے کہ مجھے خوش رہنے کا اپنی مرضی کی زندگی، اپنے پسندیدہ مرد کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے۔ وہ بڑی بے رحمی سے سماج کے ریاکاروں کے چہرے سے نقاب الٹتی ہے۔ قاضی کے ساتھ ہیر کا مکالمہ 'ہیر وارث شاہ' کا جاندار مکالمہ ہے جس میں ہیر شرع و دین سے دلائل دے کر کھٹ ملاؤں کا بھانڈہ بیچ چوراہے میں پھوڑتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ نیکی سماج کے جامد رسم و رواج کی پابندی سے حاصل ہونے والی نعمت نہیں ہے بلکہ اس کو خلوص اور پیار کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے نزدیک سچا عاشق کوئی برائی کر ہی نہیں سکتا بلکہ عشق انسان کے اندر سے خودغرضی جیسے منفی جذبے کو باہر نکال کر سچی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ بغاوت کی علمبردار ہے اپنے حق کے لیے اپنے ماں باپ، اپنے بھائی، چچا کیدو، قاضی اور معاشرے کے نام نہاد رکھوالوں سے جھگڑا مول لیتی ہے اور یوں انسان کی آزادی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس باغی روح کو علی عباس جلالپوری نے دیس پنجاب کی 'انٹی گونی' قرار دیا ہے۔ ''مقاماتِ وارث شاہ'' میں لکھتے ہیں:۔

''انٹی گونی شاہ ایڈیپس کی بیٹی تھی جس نے اپنے نابینا باپ کا آخر تک ساتھ دیا تھا جب کریون نے تھیبس فتح کر کے انٹی گونی کے بھائی پولی نیسس کو قتل کر دیا تو یہ حکم دیا کہ پولی نیسس کی لاش گھورے پر ڈال دی جائے اور کوئی اسے دفن نہ کرنے پائے جو ایسا کرے گا موت کی سزا کا

مستوجب ہوگا۔انٹی گونی نے اس جابرانہ حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے بھائی کی لاش بڑے احترام سے دفن کی۔اس جرم کی پاداش میں اسے زندہ دیوار میں چنوادیا گیا۔اس وقت سے 'انٹی گونی' عورت کی بغاوت کی علامت بن گئی ہے کیونکہ اس نے جان پر کھیل کر مرد کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا تھا۔ ہیر کا کردار بھی انٹی گونی کی طرح جدید عورت کے لیے تحریک و فیضان کا باعث ہوتا رہے گا۔''(۱۳)

ہیر کی طرح لوناں (پورن بھگت) زلیخا (یوسف زلیخا) سہتی (سہتی مراد) سوہنی (سوہنی مہینوال) اور صاحباں (مرزا صاحباں) بھی مظلوموں کی آوازیں ہیں یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے مردانہ سماج میں مرد کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا۔تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ بے شمار صاحب اختیار و اقتدار مردوں نے زبردستی عورتوں کو غلام بنایا۔ان کو اپنی جھوٹی محبت کے فریب میں پھنسایا لیکن ان مردوں کو اخلاق باختہ قرار دے کر کسی قصے کا موضوع نہیں بنایا گیا۔دوسری طرف اگر 'زلیخا' یا 'لوناں' نے اپنے محبوب سے اظہارِ عشق کیا یا ہیر نے سیدے کھیڑے سے شادی پر احتجاج کیا تو سماج نے ان کو گناہ گار ٹھہرایا۔زلیخا حضرت یوسف کے حسن سے متاثر ہوئیں تو یہ بداخلاقی تھی۔'لوناں' کو پورن کا بوڑھا باپ بیاہ لایا تھا لیکن اس کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔اس کا دکھ اور بے چارگی کسی کو دکھائی نہیں دیتی لیکن اس کے اظہارِ عشق پر اسے مطعون کیا جاتا ہے۔'لوناں' کی خواہش کو 'ہوس' اور ہیر کی محبت کو 'بغاوت' کہا گیا۔

این مری شمل نے اپنے ایک مضمون میں اس صورتحال کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے:۔

''اسلامی ثقافت کی صورت گری نہ تو عورتوں سے بھرے حرم کے شہوانی تخیلات کرتے ہیں اور نہ ہی عورتوں کی مکاری اور چلتر کے بارے میں مشہور روایات وحکایات۔ جو لوگ عربی، فارسی، ترکی اور بالخصوص ہند اسلامی دنیا کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ (اور اس میں اردو، سندھی، پنجابی اور دوسرے زبانوں کا ادب بھی شامل ہے) کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کریں گے انہیں اس تصویر سے بالکل مختلف ایک تصویر نظر آئے گی جو انہیں عام زندگی میں گلی کوچوں میں بالعموم دکھائی دیتی ہے ایسا بصیرت افروز مطالعہ شاید ہمارے کچھ تعصّبات کو ختم کردے یا انہیں کسی حد تک کم ہی کردے کیونکہ روحانی دنیا میں مرد اور عورت میں بہرحال کوئی فرق نہیں۔جیسا کہ جامی نے رابعہ بصری کے بارے میں کہا تھا۔'اگر تمام عورتیں ایسی ہوتیں جیسی رابعہ ہیں تو عورتوں کو مردوں پر ترجیح دی جاتی کیونکہ تانیث کا صیغہ سورج کے لیے باعث شرم نہیں اور نہ ہی تذکیر کا صیغہ چاند* کے لیے باعث فخر ہے۔(*عربی زبان میں سورج مونث اور چاند کے لیے مذکر صیغہ استعمال ہوتا ہے)۔'' (۱۴)

صاحباں اور ہیر دونوں کو رشتوں کی چاہ نے المناک انجام سے دوچار کیا۔سوہنی اپنی غفلت (کچے گھڑے

پر سواری) اور سسی، پنوں کی لاپرواہی (پنوں کی نیند میں اس کے بھائی اس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں) سے ناکام ہوئی۔ ماروی (عمر ماروی) کو بھی اسی اذیت کا سامنا ہے جو سسی اور سوہنی نے اٹھائی۔ ماروی اس روح کی علامت ہے جو گھر جانے کے لیے بے چین و بے قرار ہے وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی یاد میں مسلسل آنسو بہاتی ہے۔

میرے من کا دھیر کہاں ہے
وہ پیارا ملیر کہاں ہے
آنکھوں کے تارو آؤ

اودیس دلا روآؤ

اس کوٹ میں لاج نہ جائے
موت آئے تو دیس میں آئے
دکھ درد کے مارو آؤ

اودیس دلا روآؤ (۱۵)

ماروی کے دکھی دل سے نکلی فریاد برصغیر پاک و ہند کے کئی معروف لوک گیتوں کی یاد دلاتی ہے یہ وہ گیت ہیں جو دلہنیں اپنے سسرال میں اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کی یاد میں گاتی ہیں۔

کوئی قاصد نہ نامہ و پیغام
مجھ کو بھولے ہیں کیوں وہ دلآرام
ہائے افسوس بھائیوں کو بھی
یاد آیا کبھی نہ میرا نام
کون جانے اس طرح کب تک
ہے مقدر میں دانا زیرِ بام (۱۶)

ماروی کا نوحہ کہ نہ کوئی قاصد ہے نہ پیغام بر، بعد کے دور کی سندھی شاعری پر بھی چھایا ہوا ہے اور سچل سرمست کی شاعری میں بھی یہ جذبہ اکثر و بیشتر ظہور کرتا ہے۔ شاہ عبداللطیف کے خیالات کو لے کر سچل سرمست نے انہیں اپنے نسوانی کرداروں میں اس طرح سمویا کہ ان کو زیادہ جرأت، زیادہ سرمستی، زیادہ جوشیلا اظہار عطا کر دیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں بھی عورتوں کے لئے اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا۔ مغرب کی نسائی تحریک اور مشرق کی نسائی تحریک میں کچھ باتیں مشترک دکھائی دیتی ہیں مثلاً ابتداء میں دونوں طرف یہ تحریکیں

اصلاحی تحریکیں تھیں، ان دونوں تحریکوں کے ابتدائی راہنما مرد تھے، ان میں شریک لوگوں کا تعلق مراعات یافتہ طبقے سے تھا۔ اور یہ تحریکیں بنیادی طور پر دوسری سیاسی تحریکوں سے منسلک تھیں۔ خواتین جس طرح معاشرے میں اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں اسی طرح ادب کے میدان میں بھی خصوصاً ادبی تنقید کے حوالہ سے بھی سراپا احتجاج ہیں کہ آج تک خواتین کے لکھے گئے کو اہمیت نہ دی گئی ماسوائے ان خواتین کے جن کا تعلق طبقہِ خاص سے تھا یا طبقہِ اشرافیہ سے تھا۔ اس لئے ''نسائی تنقید'' ایسا فکری رجحان ہے۔ جو ان فنی تخلیقی سرگرمیوں کو چیلنج کرتی ہے جن پر مردوں کا قبضہ ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے اور مردوں نے تاریخ میں، ادب میں ان کا جائز مقام بننے ہی نہ دیا۔ اس لئے ادب کی تاریخ کو از سرِ نو تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ادب کے میدان میں بھی شاعر ہو یا ادیب، ان تخلیق کو جانچا اور پرکھا جائے اور اس پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کا مقام متعین کیا جائے۔

تنقید کا عمومی مزاج ''نظرِ ثانی'' سے عبارت ہے۔ یہ پوری ادبی تاریخ اور ثقافت کو از سرِ نو، نسائی زاویوں سے جانچنے اور مرتب کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے اور متن کی تعبیر اور تشریح کے اصولوں پر صدیوں پرانے مردانہ اجارے کو چیلنج کرتی ہے یعنی تنقیدی تاریخ اور تنقیدی نظریات پر نظرِ ثانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ (۱۷)

نسوانی تنقید اپنے فکری اور اطلاقی مراحل میں اس احساس سے برابر دوچار رہتی ہے کہ ادبی متن کی تعمیر و تعبیر سے لے کر زندگی و کائنات کی تفہیم اور ثقافت کی تشکیل تک، کو مرد نے اپنے اختیار میں رکھا ہے، اسے اپنا حق گردانا ہے اور ایک ایسا کارنامہ قرار دیا ہے جس کو صرف وہی انجام دے سکتا تھا۔ نسوانی تنقید اس دعوے کی صداقت پر شبہے کا اظہار کرتی ہے، یوں نسوانی تنقید یہیں تک محدود رہتی تو محض ایک احتجاج بن کر رہ جاتی اور ایک قابلِ ذکر تنقیدی دبستان کا درجہ اختیار نہ کرتی۔ مگر نسوانی تنقید اس سے آگے بڑھ کر عورت کی وجودی شناخت کی منزل کو سر کرنے میں بھی سرگرم ہوتی بحیثیت مجموعی یہ انسانی کلچر کو مردانہ اور نسوانی ثقافتوں سے مرکب قرار دینے میں کوشاں نظر آتی ہے۔ (۱۸)

ابھی انگریزوں کے ہندوستانیوں کو مکمل طور پر اپنے عقائد اور توقعات کے قریب لانے کے خواب پورے نہیں ہوئے تھے کہ ہندوستان کے روشن دماغ طبقے میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی، جن میں راجہ رام موہن رائے، بنکم چٹرجی، دیوندر ناتھ ٹیگور، کشیت چندر سین اور ودیا ساگر کی تحریک کا مقصد بھی قدیم مذہب اور سماج کی اصلاح تھا۔ (۱۹)

عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کے پیشِ نظر جگہ جگہ اسکول قائم کئے اور عقد بیوگان کے لئے معاشرے کو راغب کیا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں بھی مذہب اسلام کو غیر مذہب کے حملوں سے بچانے کا جذبہ بیدار ہوا۔ ان

مصلحین میں سرسید احمد خاں پہلے شخص تھے، جنہوں نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا اور ان کو زبوں حالی سے نکالنے کے لئے اصلاح کا قدم اٹھایا، معاشرے کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لئے سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں فارسی مدرسہ قائم کیا۔۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی، جس کا مقصد اعلیٰ انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنا تھا تاکہ مسلمانوں میں اس کا مذاق پیدا ہوا(۲۰)۔مسلمانوں کی ذہنی اور فکری آبیاری کے لئے سائنٹیفک سوسائٹی کی جانب سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا، سرسید نے مغربی تعلیم اور تعلیمی اداروں کا جائزہ لینے کے لئے انگلستان کا سفر کیا، وہاں سے آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا، اپنی کوششوں کو تیز کرنے کیلئے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا، جو آگے چل کر کالج بنا، جس کی موجودشکل علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔

مولوی ممتاز علی، جو تحریک آزادی نسواں کے بہت بڑے حامی تھے، انہوں نے عورتوں کی تعلیم اور حقوق پر ایک کتاب کا مسودہ خوش ہو کر دکھایا کہ سرسید خوش ہوں گے مگر ان کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اسے پھاڑ ڈالا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ان کی تحریک کو نقصان پہنچے گا۔یہی سرسید انگلستان جا کر وہاں کی لیڈیوں کی علمیت اور کارکردگی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان خواتین کو جب ہندوستان کی عورتوں کی جہالت کا علم ہوتا ہے تو وہ بہت تعجب کرتی ہیں،۔پھر ممتاز علی کو لکھتے ہیں..... ''عورتوں کی تعلیم قبل مردوں کے ہونے کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفت درماں ہے، یہ باعث ہے کہ میں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔(۲۱)

سرسید کے ہم عصروں میں بہت سے لوگ 'مشروط' تعلیم نسواں کے حامی تھے، جن میں مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، عبدالحلیم شرر وغیرہ، مگر ان میں سب سے زیادہ اہم نام خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے۔مجالس النساء میں حالی، انگریز قوم کے مہذب ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں زمانہ قدیم سے لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہے، وہاں لڑکیاں جب صاحب اولاد ہوتی ہیں تو وہ اپنی اولاد کی درست تربیت کرتی ہیں اور تعلیم دیتی ہیں، اسی وجہ سے اس قوم کے نوجوانوں میں شعور موجود ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ساری قوم سے میری یہ عرض ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں، تو خدا تعالیٰ نے جو جوہر قابل انہیں دیا ہے، اس کو خاک میں نہ ملائیں۔ ہمارا معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا یا ہمارے معاشرے کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوگی۔حالی عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کے قائل تھے۔انہوں نے لڑکیوں کی کم عمری کی شادی، ان کی نسبت طے کرتے وقت، صرف حسب ونسب کا خیال رکھنے کی مخالفت کی، انہوں نے لڑکی کی مرضی شادی کے لئے ضروری قرار دی۔اپنے ایک مضمون ''قرون اولیٰ میں مسلمان عورتوں کی حق گوئی'' کے عنوان سے لکھا

اوراس میں یہ بتایا کہ ''عورتیں جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی تھیں، اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں، فصیح و بلیغ خطبات دیتی تھیں، شاعری کرتی تھیں، خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہوکر سوال و جواب کرتی تھیں۔(۲۲)

مغربی اثرات کی وجہ سے ہندوستان میں بھی آزادیِ نسواں، خواتین میں تعلیم کو عام کرنے اور ان کے اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لیے تحریکات کا آغاز ہوا۔اس میں خصوصاً رام بائی، رکمابائی، راما بائی رانڈے نے بہت اہم رول ادا کیا۔ایشور چندر، ودیا ساگر اور پونا کے پروفیسر کاروے نے ودھوا یہ اشرم کھولے۔پارسیوں نے مختلف قسم کی تعلیم دینے کے لئے سب سے پہلے قدم بڑھایا۔انڈین سوشل کانفرنس نے عورتوں کی ترقی کے لئے مختلف قسم کے کام کیے۔مسلمانوں میں بھی خواتین کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا، نذیر احمد پہلے ناول نگار تھے جنہوں نے معاشرے کی ترقی کے لئے عورتوں کی اصلاح کو بنیادی اہمیت دی اور اپنے ناولوں کے توسط سے اس کا بیڑا اٹھایا۔اور خواتین کے لیے مذہبی تعلیم کو اہم جانتے ہوئے گھر اور گھر کی چار دیواری میں رہنے کو اہمیت دی ان کے پیش نظر بھی سرسید کی اصلاحی تحریک کے مقاصد کارفرما تھے اس لیے مولوی نذیر احمد کے ہاں عورت کے حوالے سے مخصوص تحدیدات ہیں جو عورت کو بطور فرد شناخت دینے میں مانع ہیں، تاہم دوسری شادی کے خلاف ان کا ناول 'فسانۂ مبتلا' بہت جرات مندانہ تخلیق ہے۔تہذیب الاخلاق میں بھی عورتوں کی تعلیم، تعداد ازدواج کی خرابیوں اور عقدِ بیوگان کے بارے میں تھوڑے بہت مضامین شائع ہونے لگے تھے۔۱۹۰۴ء میں تعلیمِ نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ''خاتون'' کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا تھا اور پھر عبداللہ صاحب نے تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کے لئے علی گڑھ میں عورتوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو آگے چل کر ویمینس کالج (Women's College) بنا۔آریہ سماج اور برہمو سماج نے بھی عورتوں کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لئے فضا تیار کی تھی۔(۲۳)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے ہندوستان میں سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، اور تہذیبی اعتبار سے زبردست تبدیلیاں پیدا کیں، صنعتی اور سرمایہ دارانہ تہذیب کا آغاز اسی زمانے سے ہوا اور قدیم و جدید آویزش ظہور میں آئی، ناول نگاروں کا ان حالات سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔اسی لیے زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کا شعور کم و بیش سب کے ہاں ملتا ہے اصلاحی تحریکات نے بھی ان کے اندازِ فکر پر گہرا اثر ڈالا۔چنانچہ نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنے ناولوں میں ایک ایسے انسان کا تصور پیش کیا جس کا وجود ان کے نقطہ خیال کے مطابق دورِ جدید میں کامیاب زندگی بسر کرنے اور اس عہد کے تہذیبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔نیز انہوں نے عورت کی سماجی حیثیت کا بھی جائزہ لیا(۲۴) لہذا عورتوں کی سماجی حیثیت، ان کی تربیت، پردے کی مخالفت، بغیر دیکھے شادی کے نقصانات، بغیر مرضی

کی شادی، تعلیمِ نسواں اور زندگی کی جدوجہد میں عورت، مرد کے برابر کی شریک وغیرہ وغیرہ جیسے موضوعات ہمیں مرد ناول نگاروں کے ہاں ملتے ہیں ان ناول نگاروں میں عبدالحلیم شرر، محمد ہادی حسین رسوا، راشدالخیری، محمد طیب، مرزا محمد سعید، بشیرالدین اور سید احمد دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔[اپنے تاریخی ناولوں کے برعکس شرر کے معاشرتی ناول 'بدرالنساء کی مصیبت' اور 'آغا صادق کی شادی' مسلمان عورتوں کے خلاف اردو فکشن میں پہلی موثر آواز ہے]

خواتین بھی ناول نگاری کے میدان میں اپنے تخلیقی جوہر دکھاتی ہوئی نظر آتی ہیں اور بعینہ وہی موضوعات جو مرد ناول نگاروں کے ہاں نظر آتے ہیں، خواتین کے تخلیقی تجربات کا حصہ بنتے ہیں ان خواتین میں رشیدۃ النساء، اکبری بیگم، عباسی بیگم اور حجاب امتیاز علی وغیرہ شامل ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے ناولوں نے عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، اگر مصلحین کی یہ کوشش نہ ہوتی تو خواتین کو جو مواقع آج میسر ہیں وہ نہ ہوتے۔

> ''زبان جو مولوی سید احمد دہلوی کے زمانے تک عورتوں کے لیے ایک اوزار کی حیثیت رکھتی تھی، 'عصمت' تک آتے آتے ان کے ہاتھوں میں وہ ہتھیار بن گئی جن سے وہ ایک مخصوص دائرے میں ہی سہی لیکن اپنے حقوق کی جنگ لڑتی رہیں۔'' (۲۵)

تحریکِ آزادی ملک کو غلامی سے نجات دلانے والی تحریک تو تھی لیکن اس کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے عورتوں میں روشن خیالی اور ارادے میں پختگی آئی۔یہی روشن خیالی ہمارے ادب میں Feminist movement کی بنیاد بنی، جس وقت خواتین میں روشن خیالی کی لہر دوڑ رہی تھی، اس وقت بھی خواتین اپنے نام سے مضامین شائع نہیں کرواتی تھیں بلکہ فرضی نام یا والد اور بھائی کے نام سے شائع کرواتی تھیں تاکہ ان کے خاندان کی شناخت نہ ہو سکے،[والدہ افضل علی، مسز عبدالقادر، بنت الباقر، ز، خ، ش وغیرہ محض چند مثالیں ہیں] عورتوں کا آزاد خیال ہونا اس وقت بھی قابل قبول نہ تھا۔رفتہ رفتہ صورتحال تبدیل ہوئی، انہوں نے خواتین کے مسائل جو کسی نہ کسی صورت میں آج موجود ہیں، ان پر اظہارِ خیال کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر رشید جہاں نے ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' جیسی تہلکہ خیز کتاب مصنفین کے ایک گروپ میں شامل ہو کر تخلیق کی اور اس کی اشتعال انگیز اشاعت کا اہتمام کیا اور اس کی ضبطی نے بہت سے لکھنے والوں، خصوصاً عورتوں کو ایک نئی راہ اور دعوتِ فکر دی۔یہی وجہ تھی کہ عصمت چغتائی کی تحریریں عام روش سے ہٹ کر دکھائی دیتی ہیں۔ رشید جہاں ترقی پسند تحریک کی ایک رکن تھیں اور انہوں نے اپنی حقیقت نگاری سے عورتوں کی حالتِ زار کو رقم کیا اور اس کی پسماندگی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے جنسی و اقتصادی استحصال پر کڑی نکتہ چینی کی، یہی

رشید جہاں عصمت چغتائی کی آئیڈیل ہیں اور انہی کے نصب العین کو آگے بڑھاتے ہوئے عصمت چغتائی اپنی اس آئیڈیل شخصیت سے بھی آگے نکل گئیں (۲۶)

عصمت چغتائی کی تحریروں نے عام رویہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس طرح اصلاحی اور رومانوی انداز پر لکھنے والی خواتین کی جگہ سماجی حقیقت پسندی نے لے لی۔ ان خواتین کی تحریروں میں بعض میں شدت بھی ہے اور بعض میں نرم روی۔ ان میں قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، شارعزیز بٹ، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، زاہدہ حنا، فرخندہ لودھی اور خالدہ حسین وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ شاعرات میں ادا جعفری، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، پروین فنا سید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض کے نام بہت اہم ہیں۔

طویل سفر کرنے کے بعد آج خواتین کی صف سے دلیرانہ آوازیں آرہی ہیں۔ جن میں انفرادیت بھی ہے اور جلال بھی، جن مسائل سے خواتین دوچار ہیں اپنی تحریروں میں نہ صرف ان کی طرف اشارے کیے ہیں بلکہ چیلنج بھی کیا ہے۔ آج کی تخلیق کار اپنی تخلیق میں نہ صرف محسوسات و جذبات بیان کرتی ہیں بلکہ انصاف بھی چاہتی ہیں، ان کا یہ احساس اور خود آزادانہ اظہار کی کوشش، اپنی عزت نفس اور خودداری کا احساس دلاتی ہے۔۔۔ جہاں وہ مرد کی رفیقِ حیات ہے۔۔۔۔ خوشگوار زندگی کی داتا ہے۔ صحت مند معاشرے کی تعمیر میں اس کا حصہ مرد سے زیادہ ہے، وہ اپنے حقوق اور تحفظ، اپنی انفرادیت کے ساتھ چاہتی ہے اور اس کا بے باکانہ اظہار ہی تحریکِ آزادیِ نسواں کا نتیجہ ہے۔

عورت کا شعورِ ذات تدریجی ارتقاء کے بعد سامنے آیا ہے، اب جب کہ خواتین ابتداء کی نسبت بہت سے حوالوں میں بہت تیز صورتِ حال کی حامل دکھائی دیتی ہیں۔ جس وجود کو منوانے کے لئے اس نے سیاسی اور فکری جدوجہد کی، اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی نظر آتی ہے۔ لیکن اس تمام کے باوجود ابھی دنیا کی کل آبادی کا اسّی ۸۰ فیصد حصہ خواتین کے بنیادی حقوق سے نہ صرف بے بہرہ ہے بلکہ وہ اس کو حاصل کرنے کیلئے کوشش بھی نہیں کرتیں اور اس جبر کو جو مرد نے اس پر روا رکھا ہے، اس کو قسمت کا لکھا کہہ کر قبول کئے ہوئے ہے اور گھر میں امن قائم رکھے ہوئے ہے اور اس پر قانع ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ قیصر الاسلام، قاضی، فلسفے کے جدید نظریات، اقبال اکادمی، لاہور، طبع اول ۱۹۹۸ء، ص ۵۷۴

۲۔ ایضاً ص ۵۷۵

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ سیمون دی بوائر، ''عورت''، یاسر جواد (مترجم)، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۹

۶۔ ایضاً ص ۱۰۹

۷۔ بدایونی، ضمیر علی، 'ژولیا کرسٹیوا: نسائی شعور کے عروج کی علامت'، مشمولہ، خاموشی کی آواز، مرتبین، فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۹۹

۸۔ کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲

۹۔ ایضاً ص ۴۷

۱۰۔ فہمیدہ حسین، ڈاکٹر، شاہ لطیف کی شاعری میں عورت کا روپ، شائع کردہ، شاہ عبداللطیف، بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، حیدرآباد، سندھ، ۱۹۹۶ء، ص ۵۵۰

۱۱۔ ایضاً ص ۵۵۲

۱۲۔ وارث شاہ، ہیر وارث شاہ (متن اور اردو ترجمہ)، پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۵

۱۳۔ علی عباس جلالپوری، مقامات وارث شاہ، کتاب نما، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲

14. Chapter 12: Omar Marui, Book:"My Soul is a Woman, The Feminine in Islam" by Annemarie Schimmel, translated by Susan H. Ray, Publish by The Continuum International Publishing Group Limited, Newyork, 1997.

۱۵۔ کلامِ شاہ عبداللطیف بھٹائی (اردو نثری ترجمہ)، جلد سوم، مترجمین، ڈاکٹر ایاز حسین قادری، ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۵۶

۱۷۔ نیر، ناصر عباس، جدید اور مابعد جدید تنقید، انجمن ترقی اردو، کراچی، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۷

۱۸۔ ایضاً ص ۲۹۷

۱۹۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً ص ۱۱

۲۱۔ صغرا مہدی، ''تحریک نسواں کی علمبردار''، مشمولہ، فیمینزم اور ہم، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹
۲۲۔ ایضاً ص ۲۳
۲۳۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، ص ۱۵
۲۴۔ فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، اشاعت اول ۱۹۹۲ء، ص ۱۰
۲۵۔ زاہدہ حنا، ''عورت زندگی کا زنداں''، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۸
۲۶۔ تنویر انجم، ''عصمت چغتائی کا نسائی شعور''، مشمولہ، فیمینزم اور ہم، مرتبہ فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵ء

❋❋❋